قرآن مجید کے بنیادی علوم

[”نقطہ نظر“ کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔ اس

میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

قرآن میں پانچ قسم کے علوم کا ذکر ہوا ہے۔ ان علوم کو علماء کی تشریح کے مطابق علم تذکیر بالاء اللہ، علم احکام، علم عقائد، علم تاریخ، علم موعظت اور علم آخرت کہا جاسکتا ہے۔ بعض علماء نے ان علوم کو بالاختصار علم توحید، علم رسالت اور علم آخرت بھی کہا ہے۔ شاہ ولی اللہ دہلوی نے قرآن کے جملہ علوم کی زمرہ بندی اس طرح کی ہے^۱:

(۱) علم احکام: واجب، مستحب، مکروہ، حلال و حرام۔ ان احکام کا تعلق عبادت، تدبیر منزل (معاشرت)

اور سیاست مدن وغیرہ سے ہے۔

(۲) علم مناظرہ: چاروں گم راہ فرقوں، یعنی یہود و نصاریٰ، مشرکین اور منافقین کے بارے میں بحث۔

(۳) علم تذکیر بالاء اللہ: اللہ کی نشانیوں اور انعامات کا ذکر، یعنی تخلیق ارض و سما اور خدا کی صفات کاملہ کا بیان۔

(۴) علم تذکیر بایام اللہ: ان واقعات کا ذکر جو خدا کی اطاعت کرنے والوں کی جزا اور مجرموں کی سزا سے

متعلق ہیں۔

(۵) علم تذکیر بالموت: حشر و نشر، حساب، میزان اور جنت و دوزخ کا بیان۔

جدید دور کے علماء و فضلاء نے علوم قرآن کی تقسیم ایک دوسرے زاویہ نگاہ سے کی ہے۔ اس سلسلے میں علامہ اقبال

نے حکیم عرشی امرت سہری سے ایک بار دوران گفتگو فرمایا کہ ”علم کے چار ذریعے ہیں اور قرآن مجید نے ان چاروں کی

طرف رہ نمائی کی ہے۔ مسلمانوں نے ان کی تدوین کی اور دنیا کے جدید اسباب میں ہمیشہ مسلمانوں کی منت کش

۱۔ الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، باب اول، ص ۶

رہے گی۔ پہلا ذریعہ وحی ہے اور وہ ختم ہو چکا ہے۔ دوسرا ذریعہ آثارِ قدیمہ اور تاریخ ہے جس پر قرآن کی آیات متوجہ کر رہی ہیں۔ ”سیر و افسی الارض“، اس آیت سے علمِ آثار کی بنیاد رکھ دی جس پر مسلم مصنفین نے عالی شان قصر تعمیر کیے۔ ”ذکر ہم بایام اللہ“، یہ آیت تاریخ کا ابتدائی نقطہ ہے جس نے ابن خلدون جیسے باکمال محقق پیدا کیے۔ علم کا تیسرا ذریعہ علم النفس ہے جس کا آغاز ”وفی انفسکم افلا تبصرون“ سے ہوتا ہے۔ اس علم کو حضرت جنید بغدادیٰ اور ان کے رفقاء نے کمال تک پہنچایا۔ آخری ذریعہ صحیفہ فطرت ہے، جس پر قرآن کی بے شمار آیات دلالت کر رہی ہیں، مثلاً ”والی الارض کیف سطحت“۔ اس پر علماء اندلس نے بہت توجہ مبذول کی۔ (اس کے بعد) علامہ اقبال نے کہا کہ موجودہ دنیا اپنے تمام علوم و تہذیب اور صنائع و بدائع سمیت مسلمانوں کی مخلوق ہے۔“

راقم کے نزدیک قرآن کے علوم پنجگانہ کی مذکورہ تشریح میں کئی نقائص اور کمیاں ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ ان کو کسی افراط و تفریط کے بغیر اس طرح بیان کیا جائے جس طرح قرآن میں ان کا ذکر آیا ہے۔ علماء کی تقسیمِ علوم اور ان کی اصطلاحوں کو باقی رکھتے ہوئے آگے علوم قرآن کی وضاحت کی گئی ہے۔

(۱) علمِ تذکیر بالاء اللہ کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک حصہ وہ ہے جس کا تعلق ان بے شمار نعمتوں سے ہے جو اس کائنات کے گوشے گوشے میں بکھری ہوئی ہیں اور انسان ان سے شب و روز متمتع ہوتا ہے۔ لیکن اکثر لوگ یہ نہیں سوچتے کہ ان نعمتوں سے مستفید ہونے کا تقاضا ہے کہ وہ اپنے خالق و محسن کو پہچانیں اور اس کے احسانات کے اعتراف کے ساتھ اس کا حق بھی ادا کریں۔ قرآن میں بکثرت مقامات پر ان نعمتوں کی طرف انسانوں کی توجہ مبذول کرائی گئی ہے تاکہ انھیں محسن حقیقی کا عرفان حاصل ہو۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا ہے:

فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ إِلَى طَعَامِهِ. أَنَا
صَبَبْنَا الْمَاءَ صَبًّا. ثُمَّ شَقَقْنَا
الْأَرْضَ شَقًّا. فَأَنْبَتْنَا فِيهَا حَبًّا.
وَعَبْنَا وَقَضْبًا. وَزَيْتُونًا وَنَخْلًا.
وَحَدَائِقَ غُلْبًا. وَفَاكِهَةً وَأَبًّا. مَتَاعًا
لَكُمْ وَلَا نَعْمًا لَكُمْ. (عبس: ۸۰-۲۴-۳۲)

”انسان کو چاہیے کہ اپنی غذا کو دیکھے، ہم نے
خوب پانی برسایا، پھر زمین کو پھاڑا، پھر اس کے
اندر غلے، انگور، ترکاریاں، زیتون، کھجوریں،
گھنے باغ اور میوے اور چارے اُگائے،
تمہارے لیے سامانِ زیست کے طور پر اور
تمہارے جانوروں کے لیے بھی۔“

دوسری جگہ فرمایا:

۲ ماہنامہ البیان، امرتسر، دسمبر ۱۹۳۶ء

”اور تمہارے لیے چوپایوں میں بھی جانے غور و فکر ہے۔ ان کے شکم میں گوبر اور خون کے درمیان سے ہم تمہیں ایک چیز پلاتے ہیں، یعنی خالص دودھ جو پینے والوں کے لیے نہایت خوش گوار ہے۔“

وَإِنَّ لَكُمْ فِي الْأَنْعَامِ
لَعِبْرَةً نُنَسِّقُكُمْ مِمَّا فِي بُطُونِهِ مِنْ
م بَيْنِ فَرْثٍ وَدَمٍ لَبْنَا خَالِصًا سَائِغًا
لِّلشَّرِبِينَ. (النحل: ۶۶)

ایک اور جگہ ارشاد ہوا ہے:

”اے پیغمبر ان سے کہو، کیا تم لوگوں نے کبھی غور کیا کہ اگر اللہ قیامت تک تم پر ہمیشہ رات ہی طاری رہنے دے تو اللہ کے سوا کون ہے جو تمہارے لیے روشنی لائے۔ کیا تم اس بات پر کان نہ دھرو گے؟ ان سے کہو، کیا تم لوگوں نے کبھی سوچا کہ اگر اللہ قیامت تک تم پر ہمیشہ دن ہی رہنے دے تو اللہ کے سوا کون معبود ہے جو تمہیں رات لا کر دے، جس میں تم آرام پاؤ۔ کیا تم (خدا کی اس نعمت کو) دیکھتے نہیں؟ یہ اسی کی رحمت ہے کہ اس نے تمہارے لیے رات اور دن بنائے تاکہ تم رات میں سکون و راحت پاؤ اور دن میں اپنے رب کا فضل (یعنی روزی) تلاش کرو اور تاکہ تم (ان نعمتوں پر) اس کا شکر ادا کرو۔“

قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ جَعَلَ اللَّهُ عَلَيْكُمُ
الَّيْلَ سَرْمَدًا إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ مِنْ آلِهِ
غَيْرِ اللَّهِ يَأْتِيكُمْ بَضِيئًا طَافًا
تَسْمَعُونَ. قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ جَعَلَ
اللَّهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا إِلَى يَوْمِ
الْقِيَامَةِ مِنْ آلِهِ غَيْرِ اللَّهِ يَأْتِيكُمْ بَلِيلًا
تَسْكُنُونَ فِيهِ طَافًا تَبْصُرُونَ.
وَمِنْ رَحْمَتِهِ جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ
وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ
فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ
(نقص ۱۸: ۷۱-۷۳)

ایک اور مقام پر بڑے بلیغ اسلوب میں فرمایا گیا ہے:

”کیا تم نے کبھی سوچا، یہ جو تم کھیتی کرتے ہو، اس کو تم (زمین سے) اُگاتے ہو یا ہم اُگاتے ہیں؟ اگر ہم چاہیں تو اس کو بھس بنا کر رکھ دیں اور تم باتیں ہی بناتے رہو کہ ہم تو تاوان زدہ ہو گئے،

أَفْرَأَيْتُمْ مَا تَحْرُثُونَ. ءَأَنْتُمْ تَزْرَعُونَهُ
أَمْ نَحْنُ الزَّارِعُونَ. لَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَاهُ
حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُونَ. إِنَّا
لَمُعْرِمُونَ. بَلْ نَحْنُ مُحْرِمُونَ.

افرء یتم الماء الذی تشرّبون۔ ء
 انتم انزلتموه من المزن ام نحن
 المنزلون۔ لو نشاء جعلناه اجاجا
 فلو لا تشکرون۔ افرء یتم النار الّتی
 تورون۔ ء انتم انشאתم شجرتها ام
 نحن المنشعون۔ نحن جعلناها
 تذکرة و متاعا للمقویین۔
 (واقعہ ۵۶: ۶۳-۷۳)

کیا کبھی تم نے سوچا، یہ پانی جو تم پیتے ہو اسے تم
 نے بادل سے برسایا ہے یا اس کو ہم برساتے
 ہیں؟ اگر ہم چاہیں تو اسے کھاری بنا دیں۔
 (جب حقیقت یہ ہے تو) پھر تم شکر گزار کیوں
 نہیں بنتے؟ تم نے کبھی سوچا، یہ آگ جو تم
 سلگاتے ہو، اس کے درخت تم نے پیدا کیے ہیں
 یا اس کے پیدا کرنے والے ہم ہیں؟ ہم نے اس
 کو یاد دہانی اور صحرا کے مسافروں کے لیے

فائدے کی چیز بنایا ہے۔“

جن نعمتوں کا ذکر اوپر کی آیات میں ہوا، وہ خدا کی بالکل کھلی ہوئی نعمتیں ہیں اور ہر عالم و جاہل ہر روز انھیں اپنی
 آنکھوں سے دیکھتا ہے اور ان سے فائدہ اٹھاتا ہے، پھر بھی ان میں سے بہت سے لوگ محسن حقیقی کے عرفان سے
 قاصر رہتے ہیں۔

علم تذکیر بآلاء اللہ کا دوسرا حصہ وہ ہے جو کائنات کے آثار و حوادث سے تعلق رکھتا ہے۔ آثار و مظاہر فطرت
 دراصل خدا کے علم و قدرت کی نشانیاں ہیں۔ اگر ایک صاحب علم انسان کھلے دل و دماغ کے ساتھ آثار کائنات پر غور و
 فکر کرے تو وہ ہر قدم پر محسوس کرے گا کہ یہ کائنات کوئی بازیچہ اطفال نہیں ہے، بلکہ ایک عزیز و قدیر اور علیم و حکیم ہستی
 کا کارخانہ خلق و ایجاد ہے، جہاں ہر طرف حیران کن علم کی جلوہ گری اور بے مثال نظم و قانون کی حکمرانی ہے۔ ایک ہی
 طاقت و ارادہ ہے جو ہر جگہ غالب و نافذ ہے۔ کائنات کی ہر چھوٹی بڑی چیز ایک نظام عمل کی پابند ہے اور ان کے لیے
 ممکن نہیں کہ وہ خدا کے مقرر کردہ قوانین کے دائرہ سے ایک ثانیہ کے لیے بھی قدم باہر نکال سکیں۔

قرآن کی متعدد آیات میں کائنات کی اس حکیمانہ خوبی اور اس کے حیرت انگیز نظم و قانون کی طرف تمام ہوش مند
 انسانوں کو متوجہ کیا گیا ہے اور ارباب علم و عقل کو غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے تاکہ اس ہستی برتر کا انھیں عرفان حاصل ہو
 جو اس کائنات بے کراں کی خالق و آمر ہے۔ اس سلسلے میں درج ذیل آیات بڑی اہمیت رکھتی ہیں:

(۱) اَفَلَمْ يَنْظُرُوا اِلَى السَّمَاءِ فَوْقَهُمْ
 ”کیا انھوں نے کبھی اپنے اوپر آسمان کو نہیں
 دیکھا؟ ہم نے اسے کیسا بنایا اور کس خوبی سے

اس کو آراستہ کیا ہے۔ اس میں کہیں کوئی شکاف نہیں ہے۔ اور زمین کو ہم نے پھیلا یا اور اس میں پہاڑ نصب کیے اور اس کے اندر ہر طرح کی خوش نما چیزیں اُگائیں۔ اس میں سامانِ دید ہے اور یاد دہانی بھی، ہر اس بندے کے لیے جو (خدا کی طرف) رجوع کرنے والا ہو۔“

”اور زمین میں ایک دوسرے سے ملے ہوئے کئی نخلے ہیں، انگور کے باغ ہیں اور کھجور کے درخت ہیں، جن میں کچھ اکھرے (ایک تنہ والے) اور کچھ دہرے (دو تنہ والے)، سب کو ایک ہی پانی سیراب کرتا ہے مگر مزہ میں ہم ایک کو دوسرے پر برتری دیتے ہیں۔ ان چیزوں میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو سمجھ رکھتے ہیں۔“

”اور اس کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کی تخلیق اور تمہاری زبانوں اور تمہارے رنگوں کا اختلاف بھی ہے۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں اصحابِ علم و دانش کے لیے۔“

”کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ ہی نے آسمان سے پانی برسایا، پھر اس کے ذریعے سے ہم نے پھل پیدا کیے، جن کے رنگ مختلف ہیں۔ اور پہاڑوں کے بھی مختلف حصے ہیں (بعض) سفید اور سرخ، ان کے بھی رنگ مختلف ہیں، اور (بعض) بہت گہرے سیاہ رنگ کے۔ اسی طرح آدمیوں، جانوروں اور چوپایوں کے رنگ بھی

وَالْأَرْضَ مَدَدْنَاهَا وَالْقَيْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنْبَتْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ مَّ بَهِيجًا. تَبْصِرَةً وَذِكْرًا لِكُلِّ عَبْدٍ مُنِيبٍ. (ق ۵۰: ۶-۸)

(۲) وَفِي الْأَرْضِ قِطْعٌ مُتَجَوِرَاتٌ وَجَنَّاتٌ مِّنْ أَعْنَابٍ وَزُرْعٌ وَنَخِيلٌ صِنَوَانٌ وَغَيْرُ صِنَوَانٍ يُسْقَى بِمَاءٍ وَوَاحِدٍ قَفٌّ وَنُفْضِلٌ بَعْضُهَا عَلَى بَعْضٍ فِي الْأَكْلِطِ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ. (رعد ۱۳: ۴)

(۳) وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاجْتِلَافُ السِّيَتِكُمْ وَالْوَانِكُمْطِ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّلْعَالَمِينَ. (روم ۳۰: ۲۲)

(۴) أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجْنَا بِهِ ثَمَرَاتٍ مُّخْتَلِفًا أَلْوَانُهَاطٍ وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ مَّيْضٌ وَحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ أَلْوَانُهَا وَغَرَايِبُ سُودٌ وَمِنَ النَّاسِ وَالْدَّوَابِّ وَالْأَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ كَذَلِكَ إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ

عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ غَفُورٌ. (فاطر ۳۵: ۲۷-۲۸)

مختلف ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے وہی لوگ اس سے ڈرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں۔ ے شک، اللہ بڑا زبردست اور بہت بخشنے والا ہے۔“

ان آیات سے بالکل واضح ہے کہ قرآن میں خدا شناسی کے جو دلائل دیے گئے ہیں، وہ انسان کی عقل اور اس کی فطرت، دونوں کو بغایت اپیل کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر عقل پختہ اور تربیت یافتہ ہو اور خارجی اثرات سے مغلوب ہو کر کج رو اور کج اندیش نہ ہو گئی ہو تو کائنات کے آثار و حوادث کے مشاہدہ سے وہ حقیقت الحقائق (Ultimate Truth) تک رسائی حاصل کر سکتی ہے۔ اسی بات کو اوپر کی آیت میں ”انما یحشی اللہ من“

۳ سر جیمز ایک ممتاز ماہر علم ہیئت، عظیم ریاضی داں اور ایک جید عالم طبیعیات (Physicist) گزرے ہیں۔ ایک عالم طبیعیات کی حیثیت سے ”نظریہ گیس“ اور ”اشعاع“ کے باہمی تعلق اور آزاوا الکٹران کے مختلف پہلوؤں پر ان کی فاضلانہ تحقیقات اور عالمانہ آراء ناقابل فراموش ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ سائنسی دنیا ایک عظیم المرتبت سائنس داں کی حیثیت سے ان کے کارہائے نمایاں کو ہمیشہ یاد کرتی رہے گی۔

۱۹۰۶ء میں وہ کل ۲۸ سال کی عمر میں رائل سوسائٹی کے فیلو منتخب کر لیے گئے۔ ۱۹۱۷ء میں کیمبرج یونیورسٹی نے ان کے ایک مضمون ”نظریہ تخلیق اور کوکبی حرکیات کے مسائل“ پر انھیں آدس پرانزدے کران کی عزت افزائی کی۔ کیمبرج فلاسوفیکل سوسائٹی نے بھی ”نظریہ گیس“، ”اشعاع“ اور ”سیاراتی نظام کے ارتقاء“ پر ان کی گراں قدر تحقیقات پر انھیں ہاپ کنس پرانز عطا کیا۔ سائنس کی دنیا میں ایک ماہر علم فلکیات کی حیثیت سے ان کا مقام نہایت بلند ہے۔ نظریہ تخلیق سے متعلق ان کی فاضلانہ تحقیقات پر سر آتھرائڈنگلٹن نے انھیں رائل اسٹرونومیکل سوسائٹی کا سنہری تمغہ پیش کیا۔ ۱۹۲۵ء سے ۱۹۲۷ء تک وہ اس سوسائٹی کے صدر رہے۔ ہندوستان میں کلکتہ اور بنارس جیسی معروف یونیورسٹیوں نے انھیں آنریری ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں دیں۔ سائنس سے متعلق انڈین ایسوسی ایشن نے ۱۹۳۷ء میں انھیں ”مکرجی میڈل“ دیا۔ اسی سال بنگال کی ایشیائی سوسائٹی نے بھی انھیں میڈل دے کر ان کا رتبہ بڑھایا۔ ۱۹۲۸ء میں ”نارٹ ہوڈ“ اور ۱۹۳۹ء میں ”آرڈر آف دی میرٹ“ جیسے بلند اعزازات سے نوازے گئے۔

سر جیمز نے مختلف موضوعات پر متعدد عالمانہ کتابیں تصنیف کیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں:

Mysterious Universe, Astronomy and Cosmogony. Universe Around

عبادہ العلماء“ کہا گیا ہے۔

میں یہاں دو جدید کے ایک ممتاز ریاضی داں اور ماہر علم فلکیات (Astronomer) سر جیمز جینس (Sir James Jeans) سے متعلق ایک واقعہ ذکر کروں گا جس کے راوی علامہ عنایت اللہ خاں مشرقی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

”۱۹۰۹ء کا ذکر ہے، اتوار کا دن تھا اور زور کی بارش ہو رہی تھی۔ میں کسی کام سے باہر نکلا تو جامعہ کیمبرج کے مشہور ماہر فلکیات سر جیمز جینز پر نظر پڑی جو بغل میں انجیل دبائے چرچ کی طرف جا رہے تھے۔ میں نے قریب ہو کر سلام کیا۔ انھوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ دوبارہ سلام کیا تو وہ متوجہ ہوئے اور کہنے لگے، ”تم کیا چاہتے ہو؟“ میں نے کہا دو باتیں۔ اول یہ کہ زور سے بارش ہو رہی ہے اور آپ نے چھتا بغل میں داب رکھا ہے۔ سر جیمز اپنی بدحواسی پر مسکرائے اور چھتا تان لیا۔ دوم یہ کہ آپ جیسا شہرہ آفاق عالم سائنس گر جا میں عبادت کے لیے جا رہا ہے، یہ کیا؟ میرے اس سوال پر پروفیسر جیمز لمحہ بھر کے لیے رک گئے اور پھر میری طرف متوجہ ہو کر فرمایا، آج شام کو چائے میرے ساتھ پیو۔

چنانچہ میں شام کو ان کی رہائش گاہ پہنچا۔ ٹھیک ۴ بجے لیڈی جیمز نے باہر آ کر کہا، ”سر جیمز تمہارے منتظر ہیں۔“ اندر گیا تو ایک چھوٹی سی میز پر چائے لگی ہوئی تھی۔ پروفیسر صاحب تصورات میں کھوئے ہوئے تھے، کہنے لگے، ”تمہارا کیا سوال تھا؟“ اور میرے جواب کا انتظار کیے بغیر اجرام آسمانی کی تخلیق، ان کے حیرت انگیز نظام، بے انتہا پہنائیوں اور فاصلوں، ان کی پیچیدہ راہوں اور مداروں نیز باہمی کشمکش اور طوفان ہائے نور پر وہ ایمان افروز تفصیلات پیش کیں کہ میرا دل اللہ کی اس داستانِ کبریا و جبروت پر دہلنے لگا اور ان کی اپنی کیفیت یہ تھی کہ سر کے بال سیدھے اٹھے ہوئے تھے، آنکھوں سے حیرت و خشیت کی دو گونہ کیفیتیں عیاں تھیں، اللہ کی حکمت و دانش کی ہیبت سے ان کے ہاتھ قدرے کانپ رہے تھے اور آواز لرز رہی تھی۔ فرمانے لگے، عنایت اللہ خاں! جب میں خدا کے تخلیقی کارناموں پر نظر ڈالتا ہوں تو میری تمام ہستی اللہ کے جلال سے لرزنے لگتی ہے اور جب کلیسا میں خدا کے سامنے سرنگوں ہو کر کہتا ہوں ”تو بہت بڑا ہے“ تو میری ہستی کا ہر ذرہ میرا ہم نوا بن جاتا ہے۔ مجھے بے حد سکون اور خوشی نصیب ہوتی ہے۔ مجھے دو سروں کی نسبت عبادت میں ہزار گنا زیادہ کیف ملتا ہے۔ کہو عنایت اللہ خاں،

us. Introduction to the Kinetic Theory of Gases.

یہ ان کی آخری تصنیف ہے جو انھوں نے ۱۹۴۲ء میں لکھی۔ اس کے ۴ سال بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ (مصنف)

تمہاری سمجھ میں آیا کہ میں گرجے کیوں جاتا ہوں۔

علامہ مشرقی کہتے ہیں کہ پروفیسر جمیز کی اس تقریر نے میرے دماغ میں عجیب کہرام پیدا کر دیا۔ میں نے کہا، جناب والا! میں آپ کی روح افروز تفصیلات سے بے حد متاثر ہوا ہوں۔ اس سلسلے میں قرآن کی ایک آیت یاد آگئی ہے، اگر اجازت ہو تو پیش کروں۔ فرمایا، ضرور۔ چنانچہ میں نے یہ آیت پڑھی:

وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيضٌ وَحُمْرٌ
مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهَا وَغَرَابِيبُ سُودٌ.
وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَابِّ وَالْأَنْعَامِ
مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ كَذَلِكَ إِنَّمَا
يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ.

”پہاڑوں کے بھی مختلف حصے ہیں، (بعض) سفید اور سرخ، ان کے بھی رنگ مختلف ہیں، اور (بعض) بہت گہرے سیاہ رنگ کے۔ اور اسی طرح آدمیوں، جانوروں اور چوپایوں کے رنگ بھی مختلف ہیں۔ اللہ کے بندوں میں سے صرف

(فاطر ۳۵: ۲۷-۲۸) اہل علم ہی اس سے ڈرتے ہیں۔“

یہ آیت سنتے ہی پروفیسر جمیز بولے، کیا کہا، اللہ سے صرف اہل علم ڈرتے ہیں، حیرت انگیز، بہت عجیب۔ یہ بات مجھے پچاس برس مسلسل مطالعہ و مشاہدہ کے بعد معلوم ہوئی، محمد کو کس نے بتائی؟ کیا قرآن میں واقعی یہ آیت موجود ہے؟ اگر ہے تو میری شہادت لکھ لو کہ قرآن ایک الہامی کتاب ہے۔ محمد ان پڑھ تھے۔ انھیں یہ عظیم حقیقت خود بخود معلوم نہیں ہو سکتی۔ انھیں یقیناً اللہ نے بتائی تھی۔ بہت خوب، بہت عجیب۔“

علامہ مشرقی سے پروفیسر جمیز کی مذکورہ گفتگو ایک دفتر بصیرت اور ہر صاحب نظر کے لیے ایک ایمان افروز سبق۔ اس عجیب و غریب واقعہ کا ذکر مولانا عبدالماجد دریا آبادی مرحوم نے بھی اپنے رسالہ ”صدق“ مورخہ ۱۲ فروری ۱۹۵۳ء کی اشاعت میں کیا ہے۔

(۲) علم احکام کا تعلق بندہ مومن کے طرز عمل سے ہے۔ خدا کی ذات پر ایمان لانے کے بعد اس پر بقدر استطاعت خدا کے مقرر کردہ احکام و قوانین کی پابندی لازم ہو جاتی ہے۔ یہ احکام دو طرح کے ہیں۔ ایک وہ جن کا تعلق اعمال پرستش سے ہے۔ یہ احکام عبادت ہیں اور ناقابل تغیر ہیں۔ دوسرے وہ احکام ہیں جن کا تعلق انسان کی اجتماعی زندگی سے ہے۔ اس زمرہ میں معاشرتی، اقتصادی و سیاسی اور اخلاقی احکام داخل ہیں۔ اخلاقی احکام کو چھوڑ کر بقیہ احکام میں حالاتِ زمانہ کی تبدیلی کے لحاظ سے حسب ضرورت ترمیم و اضافہ ہو سکتا ہے۔ اسی کا نام اجتہاد ہے۔

قرآن میں زیادہ تر احکام کے اصول و کلیات بیان کیے گئے ہیں اور بعض کے جزئیات بھی۔ ان تمام کئی اور مخصوص جزئی احکام کے معنی و مفہوم کو قرآن میں مختلف طریقوں سے خوب اچھی طرح واضح کر دیا گیا ہے۔ اب کسی شخص کو خواہ وہ اپنے وقت کا کتنا ہی بڑا عالم اور فقیہ کیوں نہ ہو، یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ ان کے معنی و مفہوم میں کوئی ادنیٰ حذف و اضافہ کرے۔ علماء اور فقہاء کا کام صرف یہ ہے کہ وہ قرآن کے کئی اصولوں کے مطابق صلی اللہ علیہ وسلم کی ثابت شدہ سنتوں میں زمانہ کے احوال و ظروف کی رعایت کے ساتھ ہر دور میں جزئی احکام کی تخریج کریں۔

(۳) علمِ تذکیر بایام اللہ جیسا کہ پہلے ذکر ہوا، دراصل علمِ تاریخ ہے۔ اس کو مذہبی اصطلاح میں علمِ قصص کہا جاتا ہے۔ یہ ایک مذہبی تاریخ ہے جس میں اخلاقی اور دعوتی عنصر غالب ہے۔ اس اعتبار سے اس تاریخ کا دائرہ کافی وسیع ہے۔ اس میں حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر آخری نبیؐ تک کی اہم قوموں اور ان میں مبعوث ہونے والے قابل ذکر پیغمبروں کے احوال و واقعات بیان کیے گئے ہیں۔

ان واقعات کے بیان کرنے کی ایک بڑی غرض انذار اور عبرت آموزی ہے۔ چنانچہ ایک طرف آخری نبی کے مخاطبین کو بتایا گیا ہے کہ یہ کوئی نئی دعوت نہیں ہے، بلکہ پچھلی دعوتوں ہی کی تجدید اور ان کی تکمیل ہے، تو دوسری طرف حق کے منکرین کو خبردار کیا گیا ہے کہ سنت اللہ کے مطابق ایک دن ان کو بھی اسی انجامِ بد سے دوچار ہونا ہے جس سے ان سے پہلے کی سرکش قومیں دوچار ہو چکی ہیں۔ اسی کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسکین و تشفی دی گئی ہے کہ حق و باطل کی اس لڑائی میں حق کو فتح حاصل ہوگی اور باطل سرنگوں ہوگا۔ اس باب میں اللہ کی سنت ناقابلِ تغیر ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

”اور رسولوں کے احوال میں سے یہ سارے قصے
وَكُلًّا نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنْبَاءِ الرُّسُلِ
ہم تم سے بیان کرتے ہیں (اور غرض یہ ہے) کہ
مَا نُنَبِّئُ بِهِ فُؤَادَكَ وَجَاءَكَ فِي
ان کے ذریعہ سے ہم تمہارے دل کو تقویت
هَذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَذِكْرَى
دیں، (اس کو جمائے رکھیں) اور جو حق بات ان
لِلْمُؤْمِنِينَ. (سورہ ہود: ۲۰)

قصوں میں ہے وہ تم تک پہنچ چکی ہے اور (اس میں)
مومنوں کے لیے نصیحت اور یاد دہانی ہے۔“

دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے:

”یہاں تک کہ پیغمبر بالکل مایوس ہو گئے اور انہوں نے خیال کیا کہ (کفار پر عذاب آنے کے معاملے میں) ان سے حق بات نہیں کہی گئی، (ٹھیک اس وقت) ہماری مدد ان کے پاس پہنچ گئی، پھر (اس عذاب سے) ہم نے جس کو چاہا بچا لیا اور ہمارا عذاب مجرموں سے پھرتا نہیں (یعنی واقع ہو کر رہتا ہے)۔ ان (انبیاء) کے قصوں میں عقل مندوں کے لیے عبرت ہے، (وہ ان سے سبق لیں۔“

حَتَّىٰ إِذَا اسْتَيْسَسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْا أَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوا جَاءَهُمْ نَصْرُنَا فَنُجِّى مَنْ نَشَآءُ وَلَا يُرَدُّ بَأْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ . لَقَدْ كَانَ فِي قَصصِهِمْ عِبْرَةً لِّأُولَى الْأَلْبَابِ . (سورۃ یوسف ۱۲: ۱۱۰-۱۱۱)

تاریخی واقعات کے بیان سے قرآن کی ایک غرض یہ بھی ہے کہ اہل ایمان اس سے یاد دہانی حاصل کریں، جیسا کہ سورۃ ہود کی مذکورہ آیت میں فرمایا گیا ہے ”و ذکرى للْمُؤْمِنِيْنَ“ اس سلسلے میں قرآن میں خاص طور اہل کتاب یعنی یہودیوں اور عیسائیوں کی نافرمانیوں اور بد اعمالیوں کے واقعات مکرر بیان کیے گئے ہیں تاکہ مسلمان دیکھ لیں کہ ان کی دینی اور دنیوی بربادی کے اسباب کیا تھے۔ مثلاً یہودیوں کے مذہبی افتراق اور فرقہ بندی کے حوالے سے فرمایا گیا ہے:

”ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو متفرق ہو گئے اور جنھوں نے اختلاف کیا جب کہ ان کے پاس حق کے واضح دلائل آچکے تھے۔“

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ . (سورۃ آل عمران ۳: ۱۰۵)

عیسائی علماء اور درویشوں کے خلاف توحید افعال اور ان کے دنیا پرستی کے ذکر میں ارشاد ہوا ہے:

”اے ایمان والو، اکثر علماء اور مشائخ لوگوں کا مال ناجائز طریقوں سے کھاتے ہیں اور اللہ کی راہ (یعنی توحید) سے روکتے ہیں۔ اور جو لوگ (حب دنیا میں مبتلا ہونے کی وجہ سے) سونا اور چاندی کو ذخیرہ کر کے رکھتے ہیں اور اللہ کی راہ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيُصَدُّونَ عَنِ سَبِيلِ اللَّهِ وَاللَّهُ يَكْفُرُ عَنِ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَلَا يَنْفِقُونَهَا فِي

سَبِيلِ اللَّهِ لَافْبَشِرُهُمْ بِعَذَابِ أَلِيمٍ. میں اس کو خرچ نہیں کرتے ان کو ایک دردناک
(سورہ توبہ: ۹: ۳۴) عذاب کی خبر دے دو۔“

قرآنی قصص کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ بہت اجمال کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں، یہاں تک کہ بعض قصوں میں صرف اشارے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ صرف تین سورتوں، یوسف، کہف، مریم، میں واقعات کو قدرے تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ لیکن اجمال ہو یا تفصیل، دونوں با مقصد ہیں۔ جہاں اجمال ہے وہاں ہدایت کے نقطہ نظر سے اجمال ہی مطلوب ہے اور جہاں تفصیل ہے وہاں تذکیر کا پہلو متقاضی تھا کہ اس کو کھول کر بیان کیا جائے۔

یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ انسان کی فطرت میں قصہ گوئی کی طرف طبعی میلان پایا جاتا ہے اور قصوں سے اس کو ایک گونہ شغف ہے۔ اگر داستان دلچسپ ہو تو اس کا یہ طبعی میلان اور بڑھ جاتا ہے۔ قصوں کی تفصیل سے نقصان یہ ہوتا ہے کہ قاری یا سامع کا ذہن داستان کی نیرنگی اور بواجبی میں کھوجاتا ہے اور اس کا تذکیر پہلو نظر انداز ہو جاتا ہے۔ چونکہ قرآن کا مقصد داستان گوئی نہیں ہے، اس لیے ہر جگہ واقعات کے بیان میں اختصار کو ترجیح دی گئی ہے تاکہ عبرت و موعظت کا پہلو جو مقصود داستان ہے، نگاہوں سے اوجھل نہ ہو۔

بہت سے مفسرین نے قرآنی قصوں کے اجمال کی اس غرض و غایت کو نہیں سمجھا اور ان کی تفصیل کے درپے ہو گئے۔ چنانچہ انھوں نے قرآن کے مجمل قصوں کی تفصیل یا وضاحت کی غرض سے موضوع احادیث اور اسرائیلی روایات کو کسی نقد و تحقیق کے بغیر نقل کر دیا ہے، حتیٰ کہ بیہودہ روایات کو بھی قبول کر لیا گیا ہے۔ مثلاً تفسیر ابن کثیر میں جو تفسیری طبری کا ملخص ہے، ہاروت اور ماروت کی داستان عشق دیکھ لیں۔ اسی طرح وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمَانَ وَالْقَيْنَانَ عَلٰی كُرْسِيِّهٖ جَسَدًا (سورہ ص: ۳۴) کی تفسیر میں بالکل بے سرو پاروایات بیان کی گئی ہیں^۱۔ شاہ ولی اللہ دہلوی نے لکھا ہے کہ 'لقد فتنا سليمان' کا محل جب کہ حدیث میں انشاء اللہ کے ترک کرنے اور اس پر مواخذہ کا ذکر ہوا ہے تو کیا ضرورت تھی کہ ضحہ کا قصہ بیان کیا جائے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ قرآن کے کسی مجمل قصہ کی تفصیل کرنا کوئی کارگناہ ہے۔ اصولی طور پر یہ بات پیش نظر رکھی جائے کہ قرآن میں جہاں قصوں کے بعض جزئیات چھوڑ دیے گئے ہیں، ان کی تلاش و جستجو میں نہ پڑا جائے، کیونکہ

۵ تفسیر ابن کثیر، ج ۱، ص ۲۵۹

۶ تفسیر ابن کثیر، ج ۷، ص ۲۰۱ تا ۲۰۷

۷ الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، ص ۷۷

تذکیر کے لحاظ سے ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ ترک خود اس بات کی دلیل ہے کہ متروک اجزاء غیر ضروری تھے۔ قرآنی قصص کی ایک قابل ذکر خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان میں اختلافی امور کو نظر انداز کر کے قصے کے مرکزی خیال کو اجاگر کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر سورہ کہف میں اصحاب کہف اور ان کے کتوں کی تعداد اور غار میں ان کی مدت قیام کے بارے میں پہلے سے مختلف رائیں تھیں (آیات ۲۲ تا ۲۵)، اس لیے قرآن نے ان کو مبہم ہی رہنے دیا اور ان غیر ضروری باتوں کو نظر انداز کر کے قصہ کی اصل روح کو نمایاں کیا ہے۔ اور وہ یہ کہ نیکو کار بندوں کی مدد کے سلسلے میں خدا کا وعدہ سچا ہے (سورہ کہف - ۲۱)۔ لیکن مفسرین نے حسب عادت اس اختلافی مسئلے میں قیاس آرائی سے گریز نہیں کیا ہے۔

غیر نزاعی واقعات میں کسی اجمال کی تفصیل غیر محمود نہیں ہے۔ جہاں محسوس ہو کہ اجمال کی تفصیل سے واقعہ زیادہ قابل فہم اور اس کا تذکیری پہلو مزید نمایاں ہوگا، یا اس سے قرآن کا اعجاز ظاہر ہوگا، یا اس سے قرآن کے کسی بیان کی تصدیق ہوگی تو وہاں تفصیل و توضیح میں کوئی حرج نہیں ہے۔ مثلاً درج ذیل آیات کی تفصیل مفید ہوگی:

أَنَّ الْأَرْضَ يَرْثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ. (سورہ انبیاء: ۲۱-۱۰۵)

وَقَضَيْنَا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ فِي الْكِتَابِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْأَرْضِ مَرَّتَيْنِ. (سورہ بنی اسرائیل: ۱۷-۴)

وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِيهِمْ مِنْ بَعْدِي أَهْمَةٌ أَحْمَدُ. (سورہ صف: ۶۱-۶)

اسی طرح سورہ ابولہب، سورہ کوثر اور سورہ روم میں جو تاریخی پیشین گوئیاں ہیں، ان کی تفصیل میں بھی کوئی مضائقہ نہیں، بلکہ یہ تفصیل مفید ہوگی کیونکہ اس سے قرآن کے کلام الہی ہونے کی تصدیق ہوتی ہے۔ ان کے علاوہ وہ قصے جو قرآن میں مجمل لیکن تورات میں تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں، ان کی تفصیل کی جاسکتی ہے۔ اس سے تفہیم آیت میں مدد ملے گی۔ ابتدائی چار سورتوں (بقرہ، آل عمران، نساء، مائدہ) میں اہل کتاب سے متعلق ایسے کئی واقعات ہیں جو اجمال کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔

قرآن میں بیان کردہ بعض واقعات تورات کے بیان سے مختلف ہیں۔ اگر عقلی و علمی اور تاریخی شواہد کی روشنی میں ان واقعات کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو اس سے قرآنی بیان کی صداقت ثابت ہوگی۔ مثلاً آدم و حوا کا قصہ اور سلیمان علیہ السلام کی طرف علم سحر کی نسبت وغیرہ۔

(۴) علم مباحثہ کا تعلق اس طریقہ استدلال سے ہے جو قرآن میں مشرکین عرب، منافقین مدینہ اور یہود و نصاریٰ کے عقائد و اعمال کی تردید میں اختیار کیا گیا ہے۔ اس کو معروف علم مناظرہ پر قیاس کرنا صحیح نہ ہوگا جو تمام تر

جدلی اور کلامی نوعیت کا علم ہے۔ اس سے مذہبی نزاع تو کیا ختم ہوگی، اس میں کچھ مزید اضافہ ہو جائے گا۔ قرآن کا طریقہ بحث و مجادلہ بالکل فطری اور سادہ مگر عقلی براہین پر مبنی ہے۔ مثلاً تعددِ الہ کی تردید میں جو عقلی دلیل دی گئی ہے وہ کتنی مضبوط اور فیصلہ کن ہے۔ فرمایا گیا ہے:

لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلَاءُ اللَّهِ لَفَسَدَتَا. ”اگر آسمانوں اور زمین میں ایک اللہ کے علاوہ کوئی

(سورۃ انبیاء: ۲۱-۲۲) اور الہ ہوتا تو ان کا نظم و انتظام درہم برہم ہو جاتا۔“

شُرک کی تردید میں آفات و حوادث کے حوالے سے بتایا گیا ہے کہ ان نازک مواقع پر اکثر انسان سب سہاروں کو بھول کر خدا ہی کو پکارتے ہیں، بالخصوص ان حالات میں جب نجات کے سارے ظاہری اسباب و وسائل معدوم نظر آتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی فطرت میں شرک نہیں، توحید ہے۔ ماحول کے غلط اثر کی وجہ سے یہ اصل فطرت مجبوج ہو جاتی ہے، لیکن مصائب اس عارضی حجاب کو اٹھادیتے ہیں اور اس کی اصل فطرت بے نقاب ہو جاتی ہے۔ اس صورت حال کی طرف قرآن کی متعدد آیات میں اشارے کیے گئے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ ہے:

هُوَ الَّذِي يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ط ”وہ اللہ ہی تو ہے جو تم کو خشکی اور تری، دونوں

حَتَّىٰ إِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلِكِ وَجَرِينِ ط میں سفر کراتا ہے، حتیٰ کہ (بعض اوقات) جب تم

بِهِمْ بِرِيحٍ طَيِّبَةٍ وَفَرِحُوا بِهَا جَاءَ ط کشتیوں میں سوار ہو اور وہ کشتیاں لوگوں کو باد

تَهَا رِيحٍ عَاصِفٍ وَجَاءَهُمْ ط موافق کے سہارے لے کر چلتی ہیں اور وہ اس

الْمَوْجِ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَظَنُّوا أَنَّهُمْ ط سے شادمانی محسوس کر رہے ہوتے ہیں کہ

أَحْيَطَ بِهِمْ لَا دَعَاؤَ اللَّهِ مُخْلِصِينَ ط (اچانک) بادِ مخالف کا ایک جھونکا آتا ہے اور

لَهُ الدِّينَجُ ه لَيْنُ أَنْجَيْنَا مِنْ هَذِهِ ط سمندر کی لہریں ہر طرف سے ان پر آپڑتی ہیں اور

لَنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ ط وہ یقین کر لیتے ہیں کہ بالکل گھر چکے ہیں، (اس

وقت) وہ خلوص اور للہیت کے ساتھ خدا کو

پکارتے ہیں کہ اگر تو نے ہم کو اس بلا سے نجات

دی تو ہم ضرور تیرے شکر گزار ہوں گے۔“

عیسائیوں کے عقیدہ الوہیت مسیح کی تردید میں جو عقلی دلیل دی گئی ہے، وہ مختصر لیکن انتہائی مسکت ہے۔ ارشاد ہوا

ہے: كَانَا يَا كُلَّنِ الطَّعَامَ (سورۃ مائدہ: ۵: ۷۵) ”وہ دونوں (مریم و عیسیٰ) کھانا کھاتے تھے۔“ یہودیوں کو اپنی

بد اعمالیوں اور نافرمانیوں کے باوجود یہ گھمنڈ تھا کہ حضرت ابراہیم اور ان کی ذریت سب یہودی تھے۔ اور عیسائی

کہتے تھے کہ وہ سب عیسائی تھے (سورہ بقرہ: ۱۴۰)۔ ان کی اس خوش گمانی کے جواب میں نہایت مختصر لیکن دل میں اتر جانے والی بات کہی گئی ہے۔ فرمایا ہے:

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ
وَلَكُمْ مِمَّا كَسَبْتُمْ مَجْزَاؤًا وَلَا تُسْأَلُونَ
عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ.
(سورہ بقرہ: ۱۴۱)

”یہ (خدا رسیدوں کی) ایک جماعت تھی جو
(دنیا سے) جا چکی، اس کے لیے اس کی کمائی
ہے اور تمہارے لیے تمہاری کمائی، تم سے ان
کے کاموں کے بارے میں نہیں پوچھا جائے
گا۔“

اسی طرح یہودیوں اور عیسائیوں، دونوں نے جہالت اور مذہبی تعصب کی وجہ سے ہدایت کے معاملے کو ایک قومی اور نسلی معاملہ بنا دیا تھا اور دعوے سے کہتے تھے کہ وہی لوگ ہدایت پر ہیں جو یہودی اور عیسائیوں کے بقول عیسائی ہیں۔ ان کے اس زعمِ باطل کی تردید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اسوہ کو پیش کیا گیا جن کو یہ دونوں قومیں اپنا مقتدا مانتی تھیں اور کہا گیا کہ ہدایت یا بے ہدایت وہ لوگ ہیں جو ابراہیم کے طریقے کی پیروی کرتے ہیں۔ ابراہیمؑ توحید کے علم بردار تھے جب کہ وہ شرک کی راہ میں چل رہے ہیں۔ اس دلیل قاطع کو قرآن کے لفظوں میں ملاحظہ فرمائیں:

وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصْرًا
تَهْتَدُوا ط قُلْ بَلْ مِلَّةَ آبَائِهِمْ خَنِيفًا
وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ.
(سورہ بقرہ: ۱۳۵)

”وہ کہتے ہیں کہ یہودی ہو جاؤ یا عیسائی تو
ہدایت پا لو گے۔ کہہ دو (کہ ایسا نہیں ہے)،
ہدایت پر وہ ہے جس نے ابراہیم کا طریقہ اختیار
کیا جو سب سے کٹ کر خدا کا ہو رہا تھا اور وہ
مشرک نہیں تھا، (جب کہ ان کا دامن شرک سے
آلودہ ہے)۔“

قرآن میں مثبت مباحثہ کے اصول بھی بیان کیے گئے ہیں۔ فرمایا ہے:

أَدْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمِ
وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي
هِيَ أَحْسَنُ. (النحل: ۱۶: ۱۲۵)

”اپنے رب کے (سیدھے) راستے کی طرف
بلاؤ، حکمت (یعنی علمی دلائل) اور عمدہ نصیحت
سے، اور (اگر بحث کی نوبت آجائے تو پھر)
اچھے ڈھنگ سے بحث کرو۔“

اس مجادلہ حسنہ کی ایک عمدہ مثال قرآن ہی میں موجودہ۔ اس بحث کا تعلق حضرت ابراہیم اور بادشاہ بابل سے ہے جو خود کو رب سمجھتا تھا۔ حضرت ابراہیم نے اس کے خیال کی تردید کی اور فرمایا کہ میرا رب تو وہ ہے جو جلاتا اور مارتا ہے۔ اس نے کہا، میں بھی یہ کام کرتا ہوں (بقرہ ۲: ۲۵۸)

دیکھیں، بادشاہ کا یہ جواب حقیقت واقعہ کے خلاف تھا، لیکن حضرت ابراہیم نے اس پر اعتراض کرنے کے بجائے کہ اس سے بحث دوسرے رخ پر چلی جاتی، ایک دوسری عقلی دلیل دی کہ اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے، اگر تو اس کائنات کا رب (حاکم اعلیٰ) ہے تو اس کو مغرب سے نکال دے۔ یہ سن کر وہ لا جواب ہو گیا: فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ (سورہ بقرہ ۲: ۲۵۸)

مباحثہ کا ایک عمدہ طریقہ 'مباہلہ' بھی ہے۔ یہ طریقہ اس وقت اختیار کیا جاتا ہے جب فریق مخالف کسی طرح حق بات ماننے کے لیے تیار نہ ہو اور اپنے خیال کی صحت پر مصر ہو۔ قرآن میں اس طریقہ کا ذکر ہوا ہے۔ نجران کے عیسائیوں کا ایک وفد جس میں ان کے علماء بھی تھے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے کے لیے مدینہ آیا۔ ان کو مسجد نبوی میں ٹھہرایا گیا اور ان کے ساتھ نہایت کریمانہ سلوک کیا گیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دوران گفتگو میں ان کو اسلام کی دعوت دی اور الوہیت مسیح کے عقیدے کی غلطی ان پر واضح کی۔ لیکن انہوں نے انکار کیا اور کہا کہ ان کے عقیدے میں کوئی خرابی نہیں ہے، اس لیے وہ اسلام قبول نہیں کر سکتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کج بجشی سے گریز کرتے ہوئے ان کو مباہلہ کی دعوت دی۔ قرآن میں ہے:

”اب جب کہ تمہارے پاس (مسیح کے باب میں قطعی) علم آچکا ہے تو جو شخص اس کے بعد بھی تم سے اس معاملہ میں جھٹ کرے تو کہو کہ آؤ ہم اپنے بچوں اور عورتوں کو بلا لیں اور تم بھی اپنے بچوں اور عورتوں کو بلا لو اور خود ہم بھی اور تم بھی (ان میں شامل ہوں)، پھر ہم سب عاجزی سے

فَمَنْ حَاجَّكَ فِيهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَاءَنَا وَأَبْنَاءَكُمْ وَنِسَاءَنَا وَنِسَاءَكُمْ وَأَنْفُسَنَا وَأَنْفُسَكُمْ فَتَمَّ نَبْتُهُمْ فَنَجْعَلُ لَعْنَتَ اللَّهِ عَلَى الْكٰذِبِينَ.

(سورہ آل عمران ۳: ۶۱)

دعا کریں کہ جھوٹوں پر خدا کی لعنت ہو۔“

۱ عیسائی علماء نے اپنے عقیدے کے اثبات میں حضرت عیسیٰ کے بن باپ کے پیدا ہونے کو بطور دلیل پیش کیا۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ حضرت عیسیٰ کے تو باپ نہیں تھے، حضرت آدم کے تو نہ باپ تھے نہ ماں، پھر وہ کیسے پیدا ہو گئے اور پیدا ہو کر انسان ہی رہے، خدا نہیں ہو گئے (دیکھیں سورہ آل عمران ۳: ۵۹)

لیکن عیسائی علماء مبالغہ کے لیے تیار نہیں ہوئے، کیونکہ انھیں اپنے عقیدے کی سچائی پر دل سے یقین نہیں تھا۔ یہ کام تو وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اپنے عقیدے کی صحت پر کامل یقین و اطمینان رکھتے ہوں۔ اور یہ لوگ اس یقین سے محروم تھے۔

(۵) قرآن کے علوم پنجگانہ میں سے آخری چیز علم تذکیر بالموت ہے۔ اس علم کا تعلق وقوع قیامت، حشر و نشر، پریش اعمال اور جزا و سزا یعنی جنت اور دوزخ کے احوال و مقامات کے بیان سے ہے۔ عالم آخرت کے احوال سے واقفیت کا ذریعہ صرف وحی ہے، کیونکہ عقل اس عالم کے ادراک سے قاصر ہے۔ اس علم کے مطابق ایک دن عالم مادی نیست و نابود ہو جائے گا اور ایک دوسرا عالم وجود میں آئے گا جہاں بندوں کو ان کے دنیوی اعمال کی جزا و سزا ملے گی۔ چونکہ اس عالم غیر مادی کے احوال و معاملات کی تفصیل و توضیح انسانی زبان میں جو مادی خواص رکھتی ہے، ممکن نہیں تھی، اس لیے قرآن میں ان کے بیان میں تمثیل و مجاز کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے اور غیر مشہور حقائق کو ممکن حد تک مشہور و محسوس صورت میں پیش کیا گیا ہے تاکہ بندے اس عالم اور اس کی نعمتوں کو بقدر فہم و استعداد سمجھ سکیں اور ان کے دلوں میں ان کے حصول کی تمنا پیدا ہو اور وہ دنیا کے لذائذ میں کھوکھور نہ رہ جائیں۔

اس دوسری دنیا کے اثبات میں قرآن نے جو عقلی دلائل دیے ہیں، ان میں سے بیشتر کا تعلق فطرت کے حقائق اور مظاہر سے ہے۔ مثلاً ایک جگہ کہا گیا ہے کہ اس کائنات مادی کی ہر چیز ”زوجین“ یعنی جوڑوں کی شکل میں بنائی گئی ہے۔ اس کلمہ سے اس عالم کی کوئی چیز مستثنیٰ نہیں ہے۔ ہر شے نہ صرف اپنے وجود کے لیے ”زوجین“ کی محتاج ہے بلکہ اس کا مقصد تخلیق بھی ان ہی پر منحصر ہے۔ قرآن کے الفاظ ہیں:

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ
لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ فَفِرُّوْا اِلَى اللّٰهِط
اِنِّى لَكُمْ مِنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ .
”ہم نے ہر چیز کے جوڑے بنائے تاکہ تم یاد
دہانی حاصل کرو، پس اللہ کی طرف تیز گامی
کرو، میں تمہارے لیے اس کی طرف سے

(سورہ ذاریات ۵۱: ۴۹-۵۰) کھول کر ڈرا دینے والا ہوں۔“

اس آیت میں ”زوجین“ سے مراد ایسے جوڑے ہیں جو اپنی ساخت اور خواص کے لحاظ سے باہم اختلاف رکھتے ہیں، لیکن اس اختلاف کے باوجود ان میں کامل درجہ کا اتحاد و موافقت ہے، ایسا غیر معمولی اتحاد کہ اس کو دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اس کی ایک عمدہ مثال خود مرد و عورت کا وجود ہے۔ یہ جوڑا اپنے تمام خلقی اور نفسیاتی اختلافات کے باوجود ایک دوسرے کے ساتھ متحد ہے۔ زوجین کے اس اتحاد و اختلاط کو قرآن میں وجود خدا کی ایک

بڑی نشانی کہا گیا ہے:

”اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے
تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے جوڑے
بنائے تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور
تمہارے درمیان محبت اور غم گساری پیدا کی۔
اس میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو غورو
فکر کرتے ہیں۔“

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ
أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا
وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً إِنَّ
فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ.
(سورہ روم ۳۰: ۲۱)

جب اس کائنات کی ہر چیز کی تخلیق اصولِ زوجین پر ہوئی ہے تو پھر ماننا ہوگا کہ اس عالمِ مادی کا بھی ایک زوج ہے اور وہ عالمِ آخرت ہے۔ اور یہی انسان کے سفرِ زندگی کی آخری منزل ہے۔ سورہ ذاریات کی مذکورہ بالا آیات میں ”تذکرون“ اور ”ففرؤا الی اللہ“ کے جملوں سے اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ آخرت یعنی عالمِ غیر مادی کا وجود انسان کی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ اس کو مانے بغیر اس کے بہت سے مسائل کا کوئی حل ہی نہیں ہے۔ مثال کے طور پر دنیا میں ظلم و زیادتی کے اندوہ ناک واقعات برابر پیش آتے رہتے ہیں اور موجودہ دور بھی اس سے خالی نہیں ہے۔ قانون اور عدالت کے باوجود بسا اوقات مجرموں کو ان کے جرائم کی سزا نہیں ملتی اور اگر ملتی بھی ہے تو وہ مکمل سزا نہیں ہوتی۔ مثلاً ایک شخص سیکڑوں افراد کو ناحق قتل کر دیتا ہے۔ اس دنیا میں اس جرم کی بڑی سے بڑی سزا اس کے سوا اور کیا ہوگی کہ اس قاتل کو قتل کر دیا جائے۔ لیکن کیا اس سزا کو سیکڑوں لوگوں کے قتل کی سزا کہا جاسکتا ہے؟ یہ تو ایک مقتول کی سزا ہوئی، بقیہ مقتولین کی سزا اسے کہاں ملی۔ اس کے جرم کی مکمل سزا تو یہ ہوگی کہ اس کو سومرتبہ قتل کیا جائے۔ اور یہ اس دنیا میں ممکن نہیں ہے۔ یہ صورت حال خود مطالبہ کرتی ہے کہ اس دنیا کے بعد ایک اور دنیا ہو جہاں مجرموں کو ان کے جرائم کی مکمل سزا دی جائے۔ اور اسی کا نام عالمِ آخرت ہے۔ قرآن مجید کے یہی پانچ بنیادی علوم ہیں جن کا گزشتہ صفحات میں ذکر ہوا۔ ان ہی علوم پنجگانہ کو مختلف الفاظ و اسالیب میں قرآن کی مختلف سورتوں میں پیش کیا گیا ہے جو اعجازِ بیان کا منتہائے کمال ہے۔